تاش مرزا خال مرزائف

غالب اور کلامِ غالب ازبیکستان میں

عظیم ہستیاں صرف اسی سرزمین کے لیے باعثِ فخر نہیں ہوتیں جہاں وہ جنم لیتی ہیں۔ پہلے اپنے کلام کی تخلیقی قوّت اور انسان نواز اقدار کی بدولت وہ وطنِ عزیز کی سرحدیں پار کرکے عام انسانیت کا اثاثہ بھی بن جاتی ہیں۔ لیکن کسی ملک کے علما یا شعرا دیارِ غیر میں فقط اس صورت میں مقبول و مشہور ہو سکتے ہیں، جب ان کے علمی یا شاعرانہ کارنامے دوسری زبانوں میں منتقل کیے جائیں۔ لہٰذا اس امر میں مترجم کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیوں‌کہ اسی کی کاوشوں کی بدولت ادیب یا شاعر اپنے کلام کے ذریعے اپنی جائے پیدائش سے باہر دوسرے مملک میں متعارف ہوتا ہے اور اس کی تصانیف اسی زبان کے ادب کا جزولاینفک بھی بن سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے عالمی ادبیات کی ترقّی کا عام رجحان ترجمے کے بغیر تصوّر کرنا محال ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک ادب کے لیے دوسرے ادب سے فیضیاب ہونے کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہے۔ اگر آج کل دنیا کی مختلف زبانوں میں مشہور و معروف شعرا فراق، ٹیگور، پنت، اقبال، فیض، نرالا، اور جوش کا کلام گونج رہا ہے تو اس کے لیے ہم کو مترجمین کا مرہونِ منّت ہونا پڑے گا۔

مرزا اسد اللّٰہ خان غالب بھی ایسی ہی آفاقی شخصیت میں شامل ہیں، جن کی شاعری تراجم کی وساطت سے اس وقت دنیا کے کونے کونے میں شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

سابق سوویت یونین میں کلامِ غالب کے مختلف نمونے ازبیک، تاجک، ارمنی، جارجیائی، روسی اور دیگر زبانوں میں شائع کیے گئے تھے۔ لیکن سب ترجموں میں ایک نہایت خاص فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً تاجکی زبان میں شائع شدہ کلامِ غالب کو دراصل ترجمہ نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ یہ شاعر کا وہی فارسی کلام ہے جسے صرف روسی رسم الخط (یعنی سرلک) میں پیش کردیا گیا تھا۔ ان میں زیادہ قابلِ ذکر روسی اور ازبیک ترجمے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں میں تراجم براہِ راست اردو سے کیے گئے تھے اور یہ عمل مقامی اردوداں حضرات نے یا تو خود انجام دیا یا ان کے لفظ بلفظ ترجمے کی بنیاد پر کسی شاعر نے مکمل کیا۔ باقی زبانوں میں غالب کے اشعار روسی ترجموں سے

ہوے۔ ظاہر ہے کہ اصل اشعار قاری تک دو زبانوں کی معرفت پہنچتے پہنچتے اپنی کوئی نہ کوئی خصوصیت کھو چکے ہوں گے۔

جمہوریہ ازبیکستان میں اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کا آغاز ۱۹۴۷ء سے تاشقند میں واقع وسط ایشیائی سرکاری یونیوسٹی میں ہوا تھا اور یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے، جو کہ اب تاشقند انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز میں منتقل ہو گیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں اس شعبے کی پچاسویں سالگرہ بھی منائی گئی۔

اس دوران ہمارے شعبے کے فارغ التحصیل سینکڑوں طلبا و طالبات مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مصروفِ عمل ہو کر اپنی اردودانی کو کسی نہ کسی صورت میں بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ اس شعبے کے نصابِ تعلیم میں اردو ادب ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہے، جس کے تحت طالب علموں کو مرزا غالب کی شخصیت اور کارناموں کے متعلق بعض بنیادی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور ساتھ ساتھ کلامِ شاعر کے کچھ نمونے یاد بھی کرائے جاتے ہیں۔ لیکن پوری ریاست ازبیکستان کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو غالب سے ازبیک عوام ۱۹۶۵ء تک عموماً نابلد تھے۔ اس سال تاشقند کے ایک ادبی اشاعت گھر نے ''شیدا'' کے نام سے انتخابِ کلامِ غالب کو ازبیک زبان میں پہلی بار شائع کیا۔ اس کتاب میں شاعر کی چونسٹھ غزلیں منظوم ترجمے کی شکل میں شامل تھیں۔ ''شیدا'' کے لیے ہندوستان کے نامور ادیب، شاعر اور نقّاد ڈاکٹر قمر رئیس نے، جو اس وقت ہماری یونیورسٹی میں ویزٹنگ پروفیسر تھے، ایک جامع اور خوب صورت تمہید لکھ کر ازبیک قارئین کو مرزا غالب کی شخصیت اور کلام سے پہلی بار روشناس کرایا۔ مقدمے کا ایک اور نہایت دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ازبیک پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوا کہ شاعر کی رگوں میں خطۂ سمرقند کا خون دوڑتا تھا، کیوں کہ غالب کے پردادا مرزا کوکان بیگ اپنے رفقاء سمیت وطن چھوڑ کر ''پہاڑوں سے گرنے والے سیلاب کی طرح'' ہندوستان آئے تھے۔ غالب نے خود کئی مرتبہ اپنے کو ترکی النسل آئیبک قوم سے متعلق ہونے کا فخر سے اعتراف کیا تھا۔ اس بات کی تصدیق شاعر کے حسب ذیل فارسی شعر سے بھی ہوتی ہے:

غالب از خاک پاک تورانیم لا جرم در نسب فره مندیم
ائیبکم از جماعت اتراک در تمامی نرماه ده چندیم

ان باتوں سے ہمارے عوام کے علم میں یہ اضافہ ہو گیا کہ ماضی میں وسط ایشیا اور برّصغیر کے مابین موجود قریبی روابط میں البیرونی، امیر خسرو، ظہیر الدین بابر جیسی

عظیم شخصیتوں میں مرزا غالب کی شخصیت بھی ایک نہایت اہم کڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ لہٰذا اگر کوئی ازبیک اپنے پرداداؤں کے حوالے سے غالب کو اپنا ہم وطن اور شاعر کہے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

متذکرہ بالا انتخابِ غالب ازبیکستان میں بہت مقبول ہوا، جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پینتیس ہزار کاپیوں پر مشتمل یہ ایڈیشن دو اڑھائی سال کے اندر اندر تمام کا تمام بِک گیا اور آج یہ کتاب شاید صرف لائبریریوں میں ہی مل سکتی ہے۔

غالب کے اشعار کو اردو زبان سے ازبیک میں منظوم صورت میں دو اشخاص نے منتقل کیا۔ ایک تاشقند یونیورسٹی میں اردو زبان و اداب کے معروف معّلم رحمان بیردی محمد جان اور دوسرے شاعر یان غین مرزا۔ لیکن اس کام میں بنیادی کردار اوّل الذکر، مرحوم استادِ محترم کا رہا۔ کلامِ غالب کو ازبیک زبان میں ترجمہ کرانے کی پیش کش آپ ہی کی تھی اور آپ ہی نے اس جلد کے لیے تمام اشعار کا انتخاب کر کے ان میں سے پچاس سے زائد غزلوں کو ازبیک زبان کے قالب میں ڈھالا تھا۔ باقی دس غزلوں کو حالانکہ شاعر یان غین مرزا نے منظوم شکل میں پیش کیا، لیکن ان کا اردو سے ازبیک میں لفظ بلفظ ترجمہ بھی محمد جان کے ہاتھ سے ہوا تھا۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ازبیکستان میں مرزا اسد اللّٰہ خان غالب کا کلام پہلی بار متعارف کرانے کا سہرا رحمان بیردی محمد جان ہی کے سر ہے۔ یہاں یہ بھی کہتے چلیں کہ ازبیکستان اور باقی دوسری ساری سابق سوورویت ریاستوں میں اردودانی اور اردوشناسی کا تصوّر محمد جان کا نام لیے بغیر بالکل ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت اور کارنامے ایک الگ موضوعِ گفتگو بن سکتے ہیں۔

''شیدا'' کے بعد ازبیکستان میں غالب سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس سے استادِ محترم کی اور حوصلہ افزائی ہوئی اور انھوں نے اپنے اہلِ وطن کو کلامِ غالب سے وسیع پیمانے پر متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا، جس میں وہ نتیجتاً کامیاب بھی ہوے۔ نئی کتاب کے لیے انھوں نے شاعر کے اردو کلام سے ایک سو سات غزلیں، چار قطعات، چار رباعیا ت اور ایک مخمّص انتخاب کیے۔ اس کے علاوہ غالب کے فارسی کلام سے سات غزلیں، تین رباعیات، اور ایک قطعہ شامل کیا گیا۔ نئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں آٹھ مترجمین نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام کیا۔ ان میں ازبیکستان کے معروف شعراء میر، چستی، پولات مومن، حمید غلام، واصفی اور شاہ محمدوف شامل تھے۔ لیکن یہاں بھی منصوبے کی روحِ رواں رحمان بیردی ہی تھے، انھوں نے غالب کی اسّی غزلیں، تین قطعات ازبیک زبان میں منتقل کیے اور باقی اردو اشعار کے لفظی ترجمے بھی استادِ محترم نے تیّار کر کے دیے۔

ازبیکی میں کلامِ غالب کی یہ نئی کتاب ۱۹۷۵ء میں چھپ گئی۔ اس کی بھی تعدادِ اشاعت پینتیس ہزار تھی، جو برّ صغیر پاک و ہند میں شائع ہونے والی اردو کتابوں کے حوالے سے خاصی تھی۔ یہ اشاعت بھی بہت پسند کی گئی اور مرزا غالب کو ازبیکستان میں وسیع پیمانے پر متعارف کرانے میں اس کتاب کا بھی بڑا کردار رہا۔ مندرجہ بالا دو کتابوں کی وساطت سے ازبیک قارئین کو پہلی بار مرزا غالب جیسے عظیم شاعر سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔

اب ذرا کلامِ غالب کے بعض ازبیک ترجموں پر غور کریں، جو رحمان بیردی محمد جان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ترجمے کا سلسلہ حالانکہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اس میں بہت سارے تجربات بھی ہوے ہیں پھر بھی ہر مترجم کو تخلیقی نگارشات کو دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اپنی اپنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ترجمے کا تعلّق ادبیات کی اصناف اور بالخصوص شاعری سے ہو تو یہ عمل سب سے پیچیدہ اور دقّت طلب بن جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

غزل کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالتے ہوے مترجم کو شعر کے وزن اور قافیے کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کیوں‌کہ پڑھنے والے تک نہ صرف شعر کا مفہوم و معنی پہنچانا مقصود ہوتا ہے، بلکہ شاعر کی کیفیت و جذبہ، تخیّل و مشاہدہ، لسانی اسلوب، جمالیاتی ہئیت، استعارات و تشبیہات وغیرہ کی حتّی المقدور عکّاسی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ایک عام شعر کے معنی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ ''دریا کو کوزے میں بند کرنے'' کے مترادف ہے، تو غالب کے شعر میں دریا نہیں بلکہ پورا سمندر سمٹا ہوا ہے۔ خاص طور سے اگر یہ مدِنظر رکھا جائے کہ غالب کا ''اندازِ بیاں اور'' ہے۔ اس کے علاوہ ایک شعر سے کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اہلِ زبان کو بھی یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سے معنی سے غالب کی مراد تھی، ظاہر ہے کہ اس سے مترجم کی ذمّہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے اور غالب کے درمیان تقریباً دو صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اس دوران زبان و ادب میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاعر کے کلام میں پائے جانے والے بعض الفاظ، استعارے، محاورے اور تصوّرات آجکل پرانے یا بالکل متروک ہو چکے ہیں۔ اس حوالے سے اردو کے ایک طالب علم کی اس رائے میں شاید تھوڑا بہت وزن ہے کہ ''کلامِ غالب کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے شرح والے ایڈیشن ہی زیادہ مقبول و موزوں معلوم ہوتے ہیں۔'' اگر یہ صورتِ حال اہلِ اردو کے لیے ہے تو ظاہر ہے کہ غالب کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا کام کس قدر مشکل اور دقّت طلب عمل بن جاتا ہے۔

لیکن اردو سے ازبیک میں ترجمہ کرنے کا ایک نسبتاً آسان پہلو بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دو زبانوں میں کلاسیکی شاعری کی نشو و نما صدیوں تک کم و بیش ایک مشترک ماحول میں ہوئی۔ اس وجہ سے اردو اور ازبیک شاعری میں عاشق و معشوق، گل و بلبل، شمع و پروانہ جیسی بہت ساری علامات، تلمیحات وغیرہ بڑی حد تک یکساں ہیں۔ اس کے علاوہ ان زبانوں میں مشترک الفاظ کی تعداد بھی خاصی ہے (حالانکہ بعضوں کے معنی بدل چکے ہیں) مثلاً ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' والی غزل میں کوئی تیس ایسے ہیں جو ازبیک زبان میں بھی مروّج ہیں۔ غزل ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' میں کوئی بیس لفظ مشترک ہیں: عشق، دل، جگر، تصوّف، یار، وصال، انتظار، وعدہ، دوستی، چارہ ساز، مشتاق، ناداں، غمزہ، سرمہ، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مترجم کی کامیابی صرف ان باتوں میں نہیں تھی۔ اس کا بنیادی راز رحمان بیردی کے اردو زبان پر مکمل عبور، عروض سے گہری واقفیت، غالب کے خیالات و تصوّرات کا علم اور غیر معمولی محنت و مشقّت میں پنہاں تھا۔ انھوں نے اپنے کام کو شعر کے لفظ بلفظ ادا کرنے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے متن کے ذریعے غالب کی اندرونی کیفیت، جمالیاتی حظ، زبان کی انفرادیت، غرض شعری ماحول کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ساتھ شعر کی شکل یعنی وزن، املا، ہم آہنگی، ردیف وغیرہ کو برقرار رکھنے پر بھی توجّہ دی۔

کلامِ غالب کے ازبیک ترجموں کے متعلقہ اردو اشعار کے تقابلی جائزے کے بعد یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مترجم اپنی کوششوں کی بدولت غالب کے فکر و تخیّل اور اس سے بڑھ کر شاعر کی روح کو ازبیک قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ وزن اور ردیف غزل کے اہم ترین عناصر ہیں۔ شعر کی موسیقیت، آہنگ اور روانی ان ہی پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک یا دو لفظی ردیف کے لیے دوسری زبان میں اس کا مترادف تلاش کر لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن رحمان بیردی صاحب نے اکثر و بیشتر موقعوں پر اس کا حل بڑی عمدگی کے ساتھ نکالا ہے۔ مثال کے طور پر ردیف ''میرے آگے'' کے لیے"Oldimda" ، ''میرے بعد'' کے لیے"Mendan so'ng" ، ''ہونے تک'' کے لیے "Bo'lguncha" ، ''کوئی نہ ہو'' کے لیے"Bo'lmasin" استعمال کرنے سے اصل غزل کی چاشنی اور شگفتگی ازبیک ترجمے میں بھی برقرار رہتی ہے۔ ''بنائے نہ بنے'' والی غزل کے آخری شعر کا ترجمہ، معنی، وزن اور علامت غرض ہر اعتبار سے بالکل مکمل سمجھنا چاہیے۔

Ko'tarmas sevgi zo'rlikni, shunday o'tki bu, gholib
Zo'rlab yondirib bo'lmas, zo'rlab o'chirib bo'lmas

مترجم کی عرق ریزی کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ مذکورہ دو جلدوں میں شامل کافی غزلیں وہی ہیں لیکن ترجمے کے لحاظ سے ان میں فرق نظر آتا ہے۔ عموماً کہا جا ئے تو آخری ترجمہ زیادہ پختہ اور مکمل ہے، یعنی اس میں مترجم کی دقّتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے ایڈیشن کے لیے ''وصالِ یار ہوتا'' اور ''دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں'' ان غزلوں‌کا ترجمہ یان غین مرزا نے کیا تھا۔ ان میں وزن اور معنی کے حوالے سے کچھ قابلِ اعتراض باتیں تھیں۔ لیکن دوسری کتاب میں یہ غزلیں رحمان بیردی کی نظرِ ثانی کے بعد ہر اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ رحمان بیردی نے دوسری اشاعت کے لیے اپنے پہلے ترجموں پر بھی کافی غور و خوض کیا۔ مثال کے طور پر غزل ''زلف کے سر ہونے تک'' میں قابلِ ستائش تبدیلی آ گئی، بعد کے ترجمے میں زیادہ روانی اور موسیقیت موجود ہے۔ اس بات کی تصدیق غزل کے دوسرے اور تیسرے شعروں کے ترجمے دیکھنے سے ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو تراجم کا تقابل ازبیک زبان سے نا آشنا حضرات کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے باوجود ''دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'' کے دو تراجم ملاحظہ ہوں۔ پہلا ترجمہ:

Ko' rarkim ne kunlarni
Qatra go'har bo'lguncha

دوسرا ترجمہ:

Ne-ne azob chekarkin
Qatra gavhar bo'lguncha

یہی کیفیت ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں'' والی غزل کے دونوں تراجم میں بھی واضح نظر آتی ہے۔ یا پھر پوری غزل ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' کا دوسرا ترجمہ زیادہ رواں اور پُرکشش ہے، لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ رحمان بیردی محمد جان کے تمام تراجم کسی بھی نقص یا کوتاہی سے بالکل پاک ہیں۔

بعض غزلیں ترجموں میں کچھ مختصر ہوگئیں۔ مثلاً گیارہ شعروں پر مشتمل غزل ''وصالِ یار ہوتا'' کا پہلا ترجمہ آٹھ اشعار اور دوسرا ترجمہ دس اشعار کا ہوگیا۔ ایسی اختصاری کیفیت کچھ دوسری غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ''غلطی'' کوئی ایسی خاص نہیں کیوں کہ اسے تو غزل سرا بھی کر جاتے ہیں۔ بعض غزلوں کے اندر شعروں کی ترتیب میں تبدیلی آگئی ہے۔ اختلاف کچھ ترجمہ شدہ شعروں کے وزن سے بھی

ہوسکتا ہے۔ مثلاً غزل ''ذکر اس پری وش کا'' کے ترجمے کے وزن میں ہلکا سا فرق آگیا ہے۔ بعض تراجم شاید ازبیک پڑھنے والوں کے لیے وضاحت طلب ہیں کیوں کہ ان میں موجود رمزیت، روایت، پس منظر وغیرہ سے وہ بے خبر ہیں۔ مصرع ''کاش، رضواں ہی درِ یار کا دربان ہوتا'' کا ازبیک ترجمہ معنی کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، لیکن اگر لفظ ''رضواں'' کی، جو ازبیک ترجمے میں بھی آگیا ہے، وضاحت فٹ نوٹ یا کسی اور طریقے سے کردی جاتی تو یہ مصرع پڑھنے والے کو زیادو متأثر کرتا اور اسے شاعر کے لطیف تجربے کا احساس ہو جاتا۔ لہٰذا زیادہ تر لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے ہوں گے۔

پھر بھی یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں ہر بڑے کلام میں مل جاتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ تراجم میں یہ غیر اہم اور اتنی کم ہیں کہ بنیادی طور پر کلامِ غالب کے ازبیک ترجموں پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لیے مترجم رحمان بیردی محمد جان دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔

آخری چند سالوں میں ازبیکستان میں غالب کی شخصیت اور کلام سے دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ہمارے ٹی وی پر ہندوستان کی سلسلہ وار فلم ''مرزا غالب'' ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ ازبیک زبان میں اس کی ڈبنگ امیر فیض اللّٰہ نے بڑی مہارت اور عمدگی کے ساتھ کی تھی۔ ازبیک ناظرین کو یہ فلم بہت پسند آئی۔ اس لیے یہ سیریل ٹیلی ویژن پر کئی مرتبہ دکھائی گئی۔

حال ہی میں مرزا غالب کی کچھ نئی غزلوں کا ترجمہ ہوا ہے۔ ان کو عہدِ حاضر کے مشہور و معروف ازبیک شاعر ایرکین وحید نے کیا۔ یہ ترجمے تاشقند سے شائع ہونے والے جریدے ''ادبیاتِ جہان'' میں چھپ چکے ہیں۔ اسی رسالے میں امیر فیض اللّٰہ کے دو مضامین بھی شائع ہوے۔ ایک میں صاحبِ مضمون نے زیادہ تر غالب کے ترکی النسل ہونے کے تعلّق سے گفتگو کی تو دوسرے میں شاعر کی حیات و کلام کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے۔ ساتھ ہی غالب اور ازبیک کلاسیکی شاعر علی شیر نوائی میں پائے جانے والے مشترک فنّی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی اور ان دونوں کو دو قدآور چناروں سے تشبیہ دی۔ کچھ سال پہلے ہمارے شعبے کے پروفیسر آزاد شماتوف نے غالب اکیڈمی دلّی میں غالب پر اپنے دو مقالے پڑھے تھے۔ اسی شعبے کی معلّمہ مہیا عبد الرحمٰن نے کلامِ غالب کا تقابلی انداز میں جائزہ لینا شروع کیا۔ اس سلسلے کی ان کی پہلی کڑی مرزا غالب اور ازبیک شاعر مشرب سے منسوب تھی۔ یہ مقالہ ۱۹۹۷ء کو دہلی میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں دہلی میں مرزا غالب پر منعقدہ بین الاقوامی مذاکرے کے لیے انھوں نے ایک اور تحقیقی مقالہ تیّار کیا۔ اس میں مرزا غالب کا موازنہ ازبیک کلاسیکی ادب کے بانی علی شیر نوائی سے کیا گیا۔ تقابلی

رجحان کو جاری رکھتے ہوے ہمارے شعبے کی ایک طالبہ نے ''غالب اور روسی شاعر پشکن'' کے عنوان سے ایک تھیسس تیّار کیا، لیکن اس سارے کام کو مرزا غالب پر ایک جامع اور مربوط منصوبے کے آغاز کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

ان دنوں میا عبد الرحمٰن حمانوا ''غالب کی غزلیات کا لسانی تجزیہ'' پر ایک بڑی تحقیق میں لگی ہوئی ہیں۔ ہماری دوسری معلّمہ خطوطِ غالب کے لسانی پہلو پر کام کر رہی ہیں۔

عظیم انسانوں کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اپنی وفات کے بعد بھی وہ اپنے کام کی بدولت زندۂ جاوید رہتے ہیں۔ یہ حقیقت مرزا اسد اللّٰہ خاں غالب کے کلام پر مکمل طور پر صادق آتی ہے۔

بشکریہ، ''اخبارِ اردو،'' جنوری ۲۰۰۴، صفحہ ۱۷ تا ۲۰